ساجد حمید

مدعاے متکلم اور الفاظ کی اہمیت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسان کو تحریر[۱] و تکلم[۲]، دونوں میں بیان (speech) کی صلاحیت دی گئی ہے، وہ اسی طرح کی قوی اور واضح صلاحیت ہے جس طرح کی صلاحیت حساب (math) اور فلسفہ سازی کی ہے۔ بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ قوی، اس لیے کہ انسان عامی و عارف اس صلاحیت سے اس قدر آراستہ ہیں کہ ان کی معاشرتی زندگی کا مدار ہی اسی صلاحیتِ بیان پر ہے۔ یہ قوتِ بیان دو رخ رکھتی ہے: سمع و تکلم۔ متکلم اپنے مدعا کو الفاظ کا جامہ پہنا کر سامع کے حوالے کرتا ہے، اور سامع انھیں سن کر ان کے ساتھ جڑے معنی سے متکلم کے مدعا کو پالیتا ہے۔ قوتِ بیان میں متکلم سے سامع تک جو چیز پہنچتی ہے، وہ صرف الفاظ ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ چہرے اور ہاتھوں کے تاثرات و اشارات، لیکن یہ بیان کا ایک فی صد سے زیادہ حصہ نہیں ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو الفاظ وہ واحد اور مرکزی چیز ہے جو متکلم و سامع کے درمیان چڑی چھکے (badminton) کی چڑیا (shuttlecock) کی طرح گرداں رہتی ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ — بہ حیثیت مفردات اور بہ حیثیت کلام — متکلم کے منشا و مراد تک پہنچنے کا واحد اور بنیادی ذریعہ ہیں۔ یعنی ہم الفاظ کے سوا کسی بھی اور چیز سے متکلم کے ذہن میں نہیں جھانک سکتے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب متکلم اب ہمارے پاس موجود نہ ہو کہ ہم دوبارہ اس سے پوچھ سکیں۔ لیکن اگر دوبارہ پوچھیں گے بھی تو پھر بھی واسطہ الفاظ ہی سے پڑے گا۔

---

۱ العلق ۹۶: ۳-۴۔ ’اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ‘۔

۲ الرحمٰن ۵۵: ۱-۴۔ ’اَلرَّحْمٰنُ. عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ. عَلَّمَهُ الْبَيَانَ‘۔

الفاظ جب متکلم کے مدعا کا واحد ذریعہ ہیں، تو آپ سے آپ ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ متکلم نے کیا الفاظ چنے ہیں۔ متکلم نے جو کہنا چاہا ہے، اس کے واحد امین اس کے چنے ہوئے الفاظ ہیں۔ اب مدعاے متکلم کو صحیح صحیح پانے کے لیے ضروری ہے کہ متکلم کے الفاظ ہی کو فہم مدعا کے لیے کل سرمایہ سمجھا جائے۔ الفاظ کا چناؤ متکلم کا عمل ہے، اور اسی کا حق بھی، سامع اگر اس کے الفاظ کو بدلتا ہے، تو تحریف کرتا ہے۔ حروف، کلمات، ان کی نحوی ترکیب، ان کی تقدیم و تاخیر، ان کا حقیقت و مجاز، سب متکلم کا چناؤ ہوتا ہے۔ اس کے کاپی رائٹس اسی کے پاس ہیں۔ کوئی ان میں تغیر و تبدل کا حق نہیں رکھتا، نہ انسانی تکلم میں اور نہ الٰہی کلام میں اور نہ معنی میں اور نہ کلمات میں۔ کیونکہ جیسے ہی یہ تغیر کیا جائے گا، وہ کلام متکلم کا کلام نہیں رہے گا۔ مثلاً آپ کہیں کہ ''میں مسلمان ہوں''، اور میں کہوں کہ وہابی بھی مسلمان ہوتے ہیں، تو میں آپ کا جملہ یوں بنا دوں کہ ''میں وہابی ہوں''۔ یا جملے کے الفاظ میں تو تبدیلی نہ کروں، مگر اس کا مفہوم یہی طے کر لوں کہ آپ کے جملے کا مطلب ہے کہ ''میں وہابی ہوں''۔ تو یہ آپ کے الفاظ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس لیے کہ ''مسلمان'' اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہابی لوگ 'مسلمان' لفظ کے معنی میں شامل ہیں[3]۔ اسی طرح میں اس جملے کی ترتیب بدلنے کا حق نہیں رکھتا۔ مثلاً یہ کہ ''میں مسلمان ہوں'' کو تبدیل کر کے، ''میں ہوں مسلمان'' کر دوں، خواہ آپ کی مراد بھی یہی ہو۔ الفاظ کی اس اہمیت کو ذرا تفصیل سے سمجھتے ہیں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متکلم اور الفاظ کا رشتہ

جب بھی کوئی بولنے والا بولتا ہے، تو اپنی بات کے ابلاغ کے لیے اپنے حافظے میں موجود ہزاروں الفاظ میں سے چند کو منتخب کرتا ہے، اس لیے کہ اس کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ جو بات کہنا چاہتا ہے، وہ صرف انھی الفاظ ہی کے ذریعے سے سامع تک منتقل ہوگی۔ اس کا یہ اطمینان اپنے اور اہل زبان کے لسانی تعامل (lingual convention) کے بھروسے پر ہوتا ہے، جو زندگی میں تواترات کی طرح جاری و ساری ہوتا ہے، اور اس کے لسانی حافظے کا حصہ ہوتا ہے۔ لسانی تعامل سے ہماری مراد یہ ہے کہ گرامر، الفاظ کے معنی، ان کا استعمال، ان کا مختلف مواقع پر مختلف مفہوم دینا، محاورہ، ضرب المثل، بلاغت کے ادوات کا عملی علم، اور ظواہر استعمال[4] وغیرہ کا واضح شعور اہل زبان کے ہاں بالتواتر

---

[3] ایسی ہی مثال 'الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي' (النور ۲۴:۲) والی آیت کی ہے۔ کہ زانی کنوارے زانی کے معنی میں نہیں آتا، اگرچہ کنوارا زانی بھی زانی ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک کے ساتھ خاص کرنا کسی طرح لسانی سطح پر درست نہیں۔

[4] اس پر ان شاء اللہ الگ سے لکھوں گا۔ یہاں صرف اتنا جان لیجیے کہ الفاظ و جمل کا ایک روزمرہ کا استعمال ہوتا ہے، جن میں وہ

ان کی زندگیوں میں موجود ہوتا ہے۔

پہلے ایک سادہ سی مثال دیکھتے ہیں۔ جب مہمان آتا ہے، تو ہم اس سے پوچھتے ہیں: ''ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟'' یہاں 'ٹھنڈے' سے مراد ٹھنڈے مشروبات ہیں، اور 'گرم' سے مراد چائے ہے۔ یہ جملہ ہم اس اعتماد پر بولتے ہیں کہ مہمان ٹھنڈے گرم کے اس متواتر استعمال سے واقف ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی متواتر ہے کہ 'ٹھنڈا' اور 'گرم' الفاظ کا یہ درج ذیل استعمال درست نہیں ہے۔ مثلاً میں آپ کے گھر آؤں اور آتے ہی کہوں: ''یار، گرم پلاؤ''۔ اس جملے میں ''گرم'' کا استعمال ہمارے لسانی تعامل سے بنے ہمارے حافظے میں موجود اس کے لاتعداد استعمالات کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہاں وہ چائے پلانے کے معنی نہیں دے رہا۔ اگرچہ ذرا تامل سے ہم اس کے مدعا کو پالیں گے۔

غالب کے ایک شعر میں مجھے کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک محاورے: ''زلف کا اسیر ہونا'' کو لیا اور اس کے مفہوم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس کے ایک زاویے سے متضاد مفہوم ''زلف کا مفتوح ہونا'' کو اس محاورہ کی شکل دے ڈالی: ''زلف کا سر ہونا''۔ پھر لسانی تعامل سے باہر اور غیر متواتر ہوتے ہوئے بھی استعمال کر دیا۔ اس سے غالباً مراد لی: 'معشوق کا مائل بہ کرم و وصال ہونا'، یعنی عاشق کا زلف کی اسیری سے نکل آنا اور معشوق کے دل کو جیت لینا۔ لسانی تعامل و تواتر سے ہٹنے کی وجہ سے شارحین اس کی مراد تک نہ پہنچ سکے۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ لسانی تعامل پوری طرح متکلم اور سامع کے ساتھ ہو۔ تخلیق محاورہ کا یہ عمل درج ذیل شعر کے دوسرے مصرع میں ہوا ہے:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک   کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

جب کہنے والا بول چکتا ہے، تو اس کا مدعا ہمارے سامنے بس انھی الفاظ سے کھلتا ہے، جو اس نے بولے ہوتے ہیں۔ ہم اس کے بولے ہوئے الفاظ کی جگہ اپنی پسند کے الفاظ نہیں لا سکتے۔ نہ ان میں ہم اپنی پسند کے معنی ڈال سکتے ہیں۔ لہٰذا الفاظ بھی وہی جو بولے گئے اور معنی بھی وہی جو اہل زبان کے ہاں مستعمل ہوں، اور استعمال بھی وہی جو اہل زبان کے ہاں معلوم و مستعمل ہوں۔ جن کے پیش نظر متکلم نے کلام کیا ہے۔ مثلاً جب کوئی کہتا ہے کہ ''مجھے پانی پلاؤ''، تو ہم اسے عاقل و بالغ سمجھتے ہوئے یہی سمجھیں گے کہ وہ پینے کے لیے پانی مانگ رہا ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ وہ چائے مانگ رہا ہے، یا وہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی مانگ رہا ہے۔ اب کوئی کہے کہ نہیں میں بتاتا ہوں کہ وہ پانی بول

خاص پہلو سے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے ''شرم کرو!'' کا عمومی استعمال ڈانٹنے کا ہے، محض تلقین حیا کا نہیں۔ تلقین حیا کے معنی میں لانے کے لیے سیاق و سباق میں قرائن رکھنے پڑیں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کر گرم پانی مراد لے رہا ہے تو ہم اس شارح سے معذرت کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

تو یوں بولے گئے الفاظ ہی بولنے والے کے مدعا کو جاننے کا واحد ذریعہ ہیں۔ اس لیے متکلم کے مدعا کو پانے میں یہ نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کے الفاظ کا چناؤ ناقص ہو یا غیر ناقص، دونوں صورتوں میں اس کے مدعا کے جاننے کا واحد اور پھر کہتا ہوں کہ واحد ذریعہ بس اس کے ملفوظ الفاظ ہیں۔

یہی صورت قرآن کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کے لاکھوں الفاظ میں سے ان کا چناؤ کیا ہے۔ آخر کوئی وجہ ہے کہ اللہ علیم وحکیم نے صرف انھی الفاظ کو اپنی بات کہنے کے لیے چنا۔ مثلاً سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ' کے بجاے 'الشکرُ لِلّٰهِ'، یا 'لله الحمدُ' کیوں استعمال نہیں کیا؟ سورۂ فاتحہ ہی میں 'مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ' (الآیۃ ۴) کے الفاظ پر مشتمل جملہ کیوں بنایا ہے، 'مالك يوم القيامة' کیوں نہیں کہا؟ 'اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ' (الآیۃ ۱) میں کم از کم قرآن کی حد تک اجنبی لفظ 'الْكَوْثَرَ' کیوں چنا؟ 'اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ' (آل عمران ۳: ۹۶) آیت میں 'بمكة' کے بجاے 'بِبَكَّةَ' کیوں بولا گیا ہے اور 'وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ.' (الفتح ۴۸: ۲۴) میں 'مَكَّةَ' کے بجاے 'بكة' کیوں استعمال نہیں کیا گیا؟ زانی اور زانیہ کو سو کوڑے مارو میں ''کنوارے زانی اور زانیہ'' کے الفاظ کیوں نہیں بولے گئے؟ ظاہر ہے، جس بات کو ادا کرنا پیش نظر تھا، اس کے لیے مناسب ترین الفاظ یہی تھے۔ اب اگر ہم ان کا خیال نہ کریں تو خدائی چناؤ کی توہین ہوگی۔ ہماری مراد یہ ہے کہ متکلم کے الفاظ، اس کا چناؤ ہیں اور یہ چنیدہ الفاظ ہی وہ واحد ذریعہ ہیں جو ہمیں متکلم کے مدعا تک پہنچا سکتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متکلم کی ذہنی لطافتیں اور الفاظ

اوپر کی مثالوں سے واضح ہے، متکلم کلام میں جب لفظ چن رہا ہوتا ہے تو وہ بعض لطیف پہلوؤں کا خیال بھی رکھ رہا ہوتا ہے۔ مثلاً 'بكة' اور 'مكة' کے استعمال کا فرق۔ واضح ہے کہ 'بكة' کا لفظ اپنے تاریخی حوالے کو ساتھ لے آئے گا، جب کہ 'مكة' کا لفظ عادت میں مستعمل ہونے کی وجہ سے تاریخی حوالے کو ساتھ نہیں لاتا۔ اب اگر کوئی 'بكة' کی جگہ 'مكة' بول دے، تو اس کے خیال میں تو کوئی بڑی خرابی نہیں ہوئی، لیکن زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ آیت کی ساری جان ہی نکل جائے گی۔ اس لیے متکلم کے لفظوں کے ساتھ بے اعتنائی یا ان کو خارج سے متعین کرنے کی سعی متکلم کی سخن گوئی پر حرف لانے کے مترادف ہے۔

لفظ میرے خیال میں متکلم کے منہ سے نکلتے ہی، الفاظ وہی حرمت پا لیتے ہیں جو ہر شخص کی جان، مال اور آبرو کو حاصل ہے، وہی اس کے الفاظ کو حاصل ہو جاتی ہے۔ ان میں کسی طرح کی خیانت درست نہیں ہے۔

الفاظ اور زندگی کا رشتہ

الفاظ، جیسا ہم نے پچھلے مضمون میں لکھا تھا، اہل زبان کی زندگی میں موجود اشیا و تصورات (entities) کی علامتیں ہیں۔ ان اشیا و تصورات کے ساتھ ان کا تعلق صرف زبان جاننے والے ہی جانتے ہیں۔ اشیا و تصورات کا الفاظ سے یہ تعلق لفظوں کی آواز میں نہیں، بلکہ اہل زبان کی زندگی میں ان کے استعمالات سے بنے حافظے میں ہوتا ہے۔ لفظ 'پانی' کی آواز کس شے کی علامت ہے، یہ صرف اردو جاننے والے ہی جانتے ہیں۔ اگر لفظوں کی آواز[5] ہی میں یہ معنی ہوتے تو ہمیں کوئی زبان سیکھنے کی حاجت نہ رہتی۔ مثلاً آج کل ہمارے ملک میں چینی قوم جا بجا نظر آتی ہے۔ لیکن مجال ہے ان کی زبان سے نکلنے والی آوازوں کے معنی ہم پا سکیں۔ لہٰذا، کلام کی ——— اپنے تمام اجزا سمیت ——— معنی آفرینی ہر زبان کے اہل زبان کی زندگی میں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تو جیسا ہم نے پچھلے مضمون میں لکھا تھا کہ زبان زندگی کی گود میں پلتی بڑھتی ہے۔ اس میں الفاظ و معنی کا رشتہ اہل زبان کی اسی زندگی ہی میں طے ہوتا ہے۔ تو گویا لفظ اپنے متکلم کے مدعا کا نمایندہ ہے، جسے وہ اپنے ہم زبانوں کے حوالے کر دیتا ہے، جو اس زندگی میں جی رہے ہوتے ہیں جس نے اس زبان کو وجود بخشا ہوتا ہے۔ لہٰذا جیسے ہی وہ ان کی سماعتوں سے ٹکراتا ہے، تو وہ اپنے ماحول سے بنے حافظے کی بنا پر اس کے مدعا کو پا لیتے ہیں۔ مدعا تک پہنچنے کا دوسرا وسیلہ یہی زندگی اور ماحول ہے جس میں زبان اور اس کے اہل زبان جیتے ہیں۔ اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب کسی قوم میں پردیسی زبان آتی ہے تو اپنی تہذیب ساتھ لے کر آتی ہے۔

قرآن و حدیث کے مدعا تک پہنچنے کا بھی یہی واحد اور اصل راستہ ہے کہ اللہ و رسول کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ان سے

---

۵ بولی میں لفظ صرف آواز ہے، تحریر میں اس کی رسم (یعنی لکھنے میں اس کی صورت)، دونوں کا معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب تک کہ اہل زبان اس کے معنی نہ بتائیں۔ البتہ اہل زبان اسے آواز اور رسم ہی سے پہچانتے ہیں۔ اسی وجہ سے تلفظ بدل جانے سے بعض اوقات معنی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً خلق کے معنی خ کے پیش اور زبر سے بدل جاتے ہیں یہ ہم رسم ہیں، لیکن تلفظ اور معنی میں مختلف ہیں۔ بھیجا (دماغ) اور بھیجا (بھیجنا سے) قریب الصوت بھی ہیں اور ہم رسم بھی، لیکن معنی بالکل جدا ہیں۔ یہ محض لسانی تعامل سے فیصلہ ہوگا کہ کہاں کیا بولا گیا ہے۔

آ گاہی ان کے بولے گئے الفاظ ہی سے ہوسکتی ہے۔ وہ الفاظ اپنے زمانۂ نزول یا لمحۂ ورود میں زندگی میں کیسے مستعمل تھے، کیونکہ الفاظ اہل زبان کی زندگی میں پیوست ہوتے ہیں، الگ سے کسی جگہ نہیں پائے جاتے۔ انھی کی زندگی میں ان کے مصداقات، استعمالات، اور متعلقات موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً 'جہیز' کا لفظ ہم باسیانِ پاک و ہند کے ذہن میں جو معنی رکھتا ہے، وہ پورا تصور سمجھانے کے بعد بھی غیروں کو اس سے متعلق کیفیات سمجھا دینا مشکل ہوگا۔ ذیل کے دو جملے، جہیز کے معنی سے نہیں، بلکہ معاشرے میں جہیز سے جڑے واقعات واحساسات کے بغیر سمجھ نہیں آ سکتے:

۱۔ اس کی بیٹی جہیز کی وجہ سے گھر بیٹھی ہوئی ہے۔

۲۔ بیٹی اتنے جہیز کے باوجود سسرالیوں میں عزت نہ پا سکی۔

آپ نے دیکھا کہ ان دونوں جملوں کو سمجھنے کے لیے لغت میں لکھے ہوئے جہیز کے یہ معنی کافی نہیں کہ ''وہ سامان جو ماں باپ اپنی بیٹی کو شادی میں دیتے ہیں''۔[۶] جہیز کا شادی نہ ہونے سے کیا تعلق ہے، جہیز بہو کی عزت کا سبب کیوں ہے، یہ لغت میں لکھے اس معنی سے واضح نہیں ہے۔ وہ ہماری زندگی کا تجربہ ہے کہ جہیز کا لالچ غریب بچیوں کا رشتہ ہونے میں رکاوٹ بن جاتا ہے، اور سسرال میں اس بہو کی عزت کم ہوتی ہے جو جہیز کم لے کر آئے۔ وہ دیورانیوں کے مقابلے میں بے عزت ہوتی رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ لفظ کے معنی و مقدرات اور ان کا مجاز و حقیقت اور ان کا حذف و اظہار، ان کے نتائج واقتضاءات اسی زندگی کے تجربات میں پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ زبان کو جب معاشرے سے کاٹ لیتے ہیں تو وہ محض چیستان ہے، اور دورِ جدید کے تمام لغوی نظریات کے پیچھے یہ عنصر مشکل کا باعث بنا ہوا ہے کہ زبان شاید زندگی سے الگ کوئی عمل (phenomenon) ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لفظ اور نحوی بندھن

الفاظ بالعموم تین قسم کے مانے جاتے ہیں۔ شاید تمام زبانوں میں ایسا ہی ہو، یعنی اسم، فعل اور حرف۔[۷] جب بولنے

---

[۶] علمی اردو لغت، از وارث سرہندی: ص ۵۵۶۔

[۷] حرف بھی الفاظ ہیں، نحویوں نے اسے بے معنی قرار دیا ہے کہ ان کے معنی اپنے محل سے واضح ہوتے ہیں۔ یہ درست بات نہیں ہے۔ یہ چیزوں کے احوال کے لیے بنائے گئے الفاظ ہیں۔ مثلاً پر، اوپر ہونے کی حالت کے لیے لفظ ہے، میں، اندر ہونے کی حالت کو بیان کرتا ہے۔ جس طرح الفاظ کے معنی مشترک ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بھی مشترک المعنی ہوتے ہیں۔ ان کے معنی کا تعدد اس لیے زیادہ ہے کہ یہ کسی بھی لفظ سے زیادہ مستعمل ہیں، ایک صورت یہ تھی کہ ان کی تعداد بڑھا دی جاتی اور دوسری یہ تھی کہ ان کے معنی زیادہ بڑھا دیے جائیں۔ یہی دوسرا راستہ زیادہ قرین فطرت تھا۔

والا لفظ بولتا ہے تو وہ اگر اہل زبان کے مطابق اسے نحوی ترکیب دیتا ہے تو وہ کلام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لفظ کی معنی آفرینی میں یہ پہلی پابندی ہے، جو متکلم لگا دیتا ہے۔ لفظ کئی نحوی کردار ادا کرتا ہے۔ مثلاً اسم کو دیکھیں، تو وہ جملے میں — مبتدا، خبر، فاعل، مفعول، مجرور وغیرہ جیسے — کئی کردار ادا کر سکتا ہے۔ لیکن کلام کا حصہ بنتے ہی وہ ایک متعین نحوی کردار کا پابند ہو جاتا ہے۔ مثلاً ذیل میں خالد اور زاہد کو دیکھیے:

’’زاہد نے خالد کو مارا۔‘‘

اس جملے سے پہلے زاہد اور خالد کئی نحوی کردار ادا کر سکتے تھے، مگر اب زاہد ’مارنا‘ فعل کا فاعل ہے اور خالد اس کا مفعول بہ۔ جملے کے بعد ان سے یہ کردار چھینے نہیں جا سکتے۔ متکلم نے ان کو یہی کردار سونپا ہے۔ جو متکلم کا دیا کردار ان سے چھینے گا، وہ بولنے والے کے الفاظ سے انحراف کرے گا۔ ہمیں پسند ہو یا نہ ہو، لامحالہ، متکلم کے مطابق زاہد نے مارا ہے اور خالد نے مار کھائی ہے۔ لہٰذا مدعاے متکلم پانے کے لیے نہ صرف الفاظ، بلکہ ان کے نحوی محل کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جائے گی جتنی اس کے بولے گئے الفاظ کو۔ گویا ہر لفظ کا پہلا سیاق وسباق اس کا نحوی محل ہے۔ سیاق وسباق سے ہماری مراد ’’پہرا‘‘ ہے۔ سیاق وسباق کے تمام اجزا ان پہرے داروں کا کردار ادا کرتے ہیں، جو غیر متعلقہ افراد کو اندر آنے سے روکتے ہیں۔ اسی طرح کلام میں دیگر معانی کو در آنے سے روکنے کی پہرے داری سیاق وسباق کرتا ہے، تو پہلا پہرا نحوی ترکیب لگاتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لفظ اور موقع محل

زاہد اور خالد بھی بولنے اور سننے والوں کی زندگی کا حصہ ہیں۔ مارنے کا تصور بھی ان کی زندگیوں میں موجود ایک عام عمل ہے۔ تو مثلاً اگر کسی لڑائی کا واقعہ تھا، زاہد بولنے والے آدمی کے دشمنوں کا فرد تھا اور خالد بولنے والے کا ساتھی، تو اس جملے کے معنی ہوں گے کہ خالد دشمن سے مار کھا کر آیا ہے۔ یہ معنی بولے نہیں گئے مقدر تھے۔ لیکن یہ مقدر زاہد، خالد اور بولنے والے کے احوال سے متعلق تھا۔ اس لیے لفظوں کا دوسرا سیاق وسباق متکلم، مخاطب اور زیر بحث امور اور افراد کی زندگیوں میں ہوتا ہے۔ جب ہم کلام کو اس کے اس ماحول سے کاٹ دیں گے تو وہ سادہ لغوی معنی تو دے گا۔ مدعا تک نہیں پہنچائے گا۔ موقع محل الفاظ اور جملے کے مدعا پر دوسرا پہرا ہے۔ یہ مدعا پانے کا وسیلہ بھی ہے، اور الفاظ کے معنی پر پابندی بھی لگاتا ہے۔ مثلاً اوپر مثال میں خالد اور زاہد، دنیا کا ہر خالد اور زاہد نہیں، بلکہ متکلم کے دائرۂ معلومات کے دو افراد ہیں۔ ان کو سمجھے بغیر مدعا عنقا رہے گا۔ یوں موقع محل، مخاطب اور متکلم کلام کو عموم سے نکال

کر خصوص میں بند کرتے ہیں۔

ابھی تک ہم نے یہ جانا ہے کہ لفظ، ماحول میں مستعمل معنی، نحوی محل اور بولنے اور سننے والوں کی زندگیوں سے جڑا ہوا ہے۔ ان تینوں کے ملنے سے بامعنی کلام وجود پذیر ہوتا ہے۔ اگرچہ میرے نزدیک کلام کے اجزا اس سے زیادہ ہیں۔ لیکن، آج ہمارا موضوع چونکہ لفظ کی اہمیت ہے۔ اس لیے کلام پر زیادہ بات کرنے کے بجاے لفظ پر بات کریں گے۔[8]

قاصد مدعا

ہر لفظ قاصد یا مرکب[9] مدعا ہے۔ اسی پر سوار ہو کر مدعا سامع تک پہنچتا ہے۔ جب لفظ کلام کا جزو بنتا ہے تو مذکورہ بالا تینوں اجزا کے باہمی تعاون سے مدعا کو وجود ملتا ہے۔ مثلاً گولی کا لفظ لیجیے: ہر اس گول چیز کے لیے بول لیا جاتا ہے، جو سائز میں بہت بڑی نہ ہو، دیسی لیموں کے سائز کی یا اس سے بھی چھوٹی: کنچا[10] (marble)، دوا کا حَبّ (tablet)، اور بُلٹ (bullet) وغیرہ کے لیے یہ اسم کے طور پر مستعمل ہے۔ غرض یہ لفظ ان معانی کے انتقال کے لیے مرکّب ہے۔ گولی کا لفظ سنتے ہی، یہ دونوں تینوں معنی ذہن میں کلبلانے لگتے ہیں۔ لفظ کا یہ عمل پتا دیتا ہے کہ وہ متکلم کے مدعا کا قاصد ہے۔ یہ قاصد متکلم کے ذہن کا براہ راست شاہد ہے، اس لیے کہ وہ اس کے ذہن سے سیدھا زبان پر جاری ہوا اور وہاں سے سامع تک پہنچا ہے۔ دوسری جانب سامع کے ذہن میں موجود گولی کے تصورات کو یہ قاصد بیداری میں لے آتا ہے۔ گویا متکلم کے ذہن سے اٹھ کر سامع کے ذہن میں کھلبلی مچاتا ہے۔ یوں متکلم کے الفاظ ہی سامع کے ذہن کے متعلقہ حصوں کو چھیڑتے، اور اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ لہٰذا متکلم کے مدعا کو پانے کے لیے اپنی نہیں، بلکہ متکلم کے قاصد کی بات سننی پڑے گی۔

لفظ قرینۂ صارفہ

قرینۂ صارفہ سے مراد یہ ہے کہ کلام میں ہر وہ چیز جو ہمیں لفظ یا جملوں کے ایک معنی سے ہٹا کر دوسرے معنی کی طرف لے جائے۔ لفظ نہ صرف متکلم کے مدعا کو دوسروں تک منتقل کرتا ہے، بلکہ کلام میں موجود ہر ہر لفظ دوسرے الفاظ

---

[8] آگے ہم تشکیلِ موقع محل پر بھی بات کریں گے، یہاں اس بحث کو مکمل نہ سمجھیں۔

[9] carrier۔

[10] کانچ کی گولیاں جس سے بچے کھیلتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کے معنی کے تعین کے لیے ایک قرینۂ صارفہ بھی بن جاتا ہے۔لہٰذا ایک لفظ ـــــ دوسرے الفاظ کی موجودگی میں ـــــ متعدد احتمالات کو اپنے دامن سے جھاڑ کر ایک مفہوم تک محدود ہو جاتا ہے۔ ذیل کے جملے میں 'گولی' کے لفظ پر غور کریں:

''اس نے گولی کھائی۔''

گولی، بچوں کے کھیلنے کا کنچا بھی ہو سکتی ہے، دوا کی بھی اور بندوق کی بھی۔ سیاق میں موجود 'کھائی' کا لفظ اس کو کنچے کی گولی مراد لینے میں مانع بن گیا ہے، یعنی جملے میں لفظ ''کھائی'' ایک قرینۂ صارفہ ہے۔ اردو محاورے میں بندوق کی گولی کھانا بھی درست ہے اور دوا کی گولی کھانا بھی۔ اس لیے گولی کے اس جملے میں دو معنی ممکن ہیں۔ ان دونوں معنی میں کھائی اور گولی دونوں ایک دوسرے کے لیے قرینۂ صارفہ ہیں۔ جس طرح 'کھائی' کا لفظ 'گولی' کے معنی کی تخصیص کر رہا ہے۔ اسی طرح 'کھائی' کے معنی پر لفظِ 'گولی' بھی اثر انداز ہوگا۔ اگر گولی کو بندوق کی گولی لیا جائے تو کھانے کا مفہوم گولی لگنے، اور جسم میں گھس جانے کا ہوگا۔ لیکن اگر اسے دوا کی گولی ڈسپرین وغیرہ مراد لیں تو اس کے معنی نگلنے کے ہوں گے۔ تو یوں 'گولی' کا لفظ 'کھائی' اور 'کھائی' کا لفظ 'گولی' کے معنی پر اثر انداز ہو رہا ہے، اور ان میں معنی کو تبدیل اور متعین کر رہا ہے۔

بظاہر یہ جملہ دونوں مفاہیم کو قبول کر پا رہا ہے۔ لیکن ذرا غور کریں کہ اس جملہ کہ

''اس نے گولی کھائی''۔

کا پہلا مفہوم ہمارے ذہن میں دوا کھانے ہی کا آتا ہے۔ ظواہر استعمال کی بنیاد پر زبان کا عمومی ذوق یہ بتا رہا ہے کہ ہم بندوق کی گولی والا جملہ یوں نہیں بولتے۔ زبان کا یہ عمومی ذوق یہ چاہتا ہے کہ اسے اس جملے میں دوا کے معنی میں لیا جائے۔ وہ اس لیے کہ اس جملے میں فاعل کا گولی کھانے کا ارادہ پایا جاتا ہے، جو بندوق کی گولی کے لیے درست نہیں۔ یہ اسالیب واستعمال کا ذوق کہلائے گا۔ یعنی اس بات کا شعور کہ بندوق کی گولی والا جملہ اپنی ساخت میں مختلف ہوتا ہے۔ یہ پہچان اہل زبان کو تو ہوتی ہے، لیکن غیر اہل زبان اس میں غلطی کھا سکتے ہیں۔ بندوق کی گولی والا جملہ میرے خیال میں کچھ یوں ہونا چاہیے: ''اسے گولی لگی''۔ اگر 'کھائی' کو جملہ میں استعمال ہی کرنا ہے تو اس کے لیے ہم 'سینہ پر' یا 'پیٹھ پر' وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً: 'اس نے سینے پر گولی کھائی'۔ اب میرے خیال میں اس جملے کہ 'اس نے گولی کھائی' میں ایک احتمال گولی کے مشترک المعنی ہونے کی وجہ سے تھا، وہ رفع ہو چکا ہے۔ 'گولی' کے ساتھ 'کھائی' کا استعمال اور اس کا اسلوب استعمال گولی کو دوا کے معنی میں لینے پر مجبور کرتا ہے۔

اس جملے میں 'سینے پر' کا اضافہ نے 'گولی' کا مفہوم دوسرے معنی میں واضح طور پر متعین کر دیا ہے۔ باقی تمام احتمالات

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رفع ہو گئے ہیں۔ یہاں دیکھیے کہ جملے کے ہر لفظ نے ہر دوسرے لفظ کے لیے قرینۂ صارفہ کا کردار ادا کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر لفظ باقی الفاظ کے لیے ایک سیاق وسباق تخلیق کرتا ہے۔ یہ تیسرا سیاق وسباق ہے، جو ہر لفظ نے ہر دوسرے لفظ کے لیے تشکیل کیا ہے۔ اس طرح ہر لفظ دوسرے لفظ کا پہرے دار بن گیا ہے۔

اب مشترک المعنی لفظ اپنے ایک مقصود معنی کے سوا باقی تمام معانی کو ان سیاق ہاے کلام کی وجہ سے ترک کر دیتا ہے۔ یوں کلام تعددِ معنی سے تاویل واحد کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ بالعموم احتمال وہاں پر ہوتا ہے، جہاں محل استعمال اور اسالیب کے ذوق کے بجاے لفظ کو تجرید میں دیکھا جائے۔ مثلاً ''اس نے گولی کھائی'' سے جو اسلوب کا استدلال میں نے اوپر کیا ہے، اس سے کوئی اختلاف کر سکتا ہے کہ نہیں 'بندوق کی گولی' والا جملہ یوں بھی بولا جا سکتا ہے۔ تو اب یہاں ہمارے پاس ایسا قرینۂ صارفہ نہیں ہے، جیسے 'سینہ پر' کا قرینہ ہے۔ لیکن اسالیب کا قرینہ پوری قوت سے موجود ہے۔ 'ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ' میں یہی ہوا ہے کہ یہاں 'سینہ پر' کی طرح کا قرینۂ صارفہ موجود نہیں ہے۔ لیکن یہاں 'وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ' کا قرینہ واضح طور پر موجود تھا۔ لٰہذا، 'قُرُوْء' سے مراد وہی چیز لی جائے گی جس سے 'ارحام' کی حقیقت واضح ہو، وہ طہر سے نہیں حیض سے واضح ہوتی ہے۔ لیکن یہ قرینہ اس لیے کام نہیں آ سکا تھا کہ احکامی آیات میں یہ دو الگ الگ حکم مانے گئے، اس لیے ایک دوسرے کے لیے قرینہ نہ بن سکے، حالاں کہ آیت میں بالکل ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یوں جڑے ہونا ہی قرائن صارفہ کو وجود پذیر کرتا ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ.... (البقرہ ۲: ۲۲۸)

مختصر یہ کہ ہر لفظ جملے میں دوسرے لفظوں کے لیے سیاق وسباق اور قرینۂ صارفہ ہے۔ یوں الفاظ جملے میں موجود لفظوں پر پابندیاں اور پہرے لگاتے جاتے ہیں، جس سے باقی معانی کے در آنے کے راستے بند ہوتے جاتے ہیں۔

اس زاویے سے لفظ کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً لفظ پھینکنا، مارنا، اور گرانا اگر پتھر کے ساتھ بولے جائیں تو معنی میں کافی فرق رکھتے ہیں۔ اس نے پتھر مارا، اس نے پتھر پھینکا اور اس نے پتھر گرایا۔ تینوں جملوں میں پتھر کے ساتھ ایک ہی کام نہیں ہوا، بلکہ ہر ایک عمل مختلف ہے۔ 'پتھر پھینکنے' میں 'مارنے' کا عنصر شامل نہیں، 'پتھر مارنے' میں 'پھینکنا' تو شامل ہے، مگر مجرد پھینکنا اس کا مفہوم نہیں ہے، بلکہ کسی شخص یا چیز کو پتھر کا ہدف بنایا جانا ضروری ہوگا۔ 'گرانا' ان دونوں سے مختلف ہے۔ سورۂ فیل میں 'تَرْمِیْهِمْ' کا جملہ آیا ہے۔ اس میں 'رمی' کا مفہوم وہی ہے جو پتھر پھینکنے اور مارنے کا ہے۔ اس میں گرانے کا مفہوم یکسر نہیں ہے۔ اب خارج سے مروی اخبار کی روشنی میں اس لفظ میں

یہ مفہوم ڈالا گیا کہ پرندے یہ پتھر گراتے تھے۔اب ان مرویات کی خاطر ہم قرآن کے چنے لفظ کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ مرویات ـــــ جن میں رواۃ کا فہم وخطا شامل ہے، ـــــ کو اہمیت دیتے ہیں اور 'رمی' کے معنی گرانے کے کر دیتے ہیں۔ترجمہ پھینکنا لکھا ہوگا، مگر مفہوم گرانے کے مراد لیا جائے گا۔مثلاً اگر میں نے ہاتھ میں پتھر پکڑا ہو، اور اسے میں پھینکے بغیر صرف ہاتھ کھول دوں تا کہ وہ پتھر گر جائے، جیسے روایات میں چڑیاں کرتی تھیں، تو اس کے لیے 'رمی'، پھینکنا یا مارنا کسی صورت درست نہیں ہے۔اس کے لیے چھوڑنا اور گرانا ہی درست اور فصیح ہے۔

ہندوستان کے ایک فاضل صاحب علم ـــــ اللہ ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے ـــــ نے ،قرآن سے روایات کو مطابقت دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ چڑیاں پتھر چھوڑتی تھیں، اور ہوا ان کے پتھروں کو اڑاتی ہوئی 'رمی' کا عمل بنا دیتی تھیں۔اس نکتہ سنجی کو اللہ قبول فرمائے، کیونکہ قرآن سے مطابقت ایک محمود عمل ہے۔ہم اس تاویل کو بفرض محال مان بھی لیں تو سوال یہ پیدا ہو جائے گا کہ پھر 'رمی' کا فاعل پرندے ہوئے یا ہوائے تند؟ ہوا کو مانیں تو تب کلام قبول نہیں کرتا کیونکہ ''ہوا'' سیاق سباق میں موجود ہی نہیں ہے اور پرندوں کو مانیں تو 'رمی' قبول نہیں کرتا۔ناپاے ماندن نہ جاے رفتن۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دوسرے یہ کہ روایات کا خون تو پھر بھی ہو گیا، جن روایتوں کے دفاع میں یہ تاویل کی گئی وہ ـــــ جزواً ہی سہی ـــــ رد تو ہو گئیں۔مرویات میں بیان کردہ پتھر گرانے کے طریقے کے لیے زیادہ موزوں الفاظ: 'تسقط'، 'ترسل' یا 'تمطر' ہوتے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ ان روایات میں اسی طرح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، 'رمی' استعمال نہیں ہوا[11] کیونکہ زبان کا تواتر راویوں پر غالب رہا۔اس لیے کہ 'رمی' کا مفہوم اور عمل یکسر مختلف ہے۔'رمی' کے عمل کو زندگی کے اس عمل سے مجرد نہیں کیا جا سکتا، جس میں تیر اور پتھر مارے جاتے اور تہمت دوسرے پر لگائی جاتی ہے۔[12] اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ ہم اس آیت کا مفہوم جو بھی طے کریں، اس میں خدا کے چنے لفظوں کو اصل اہمیت دیں، کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ

۱۱؎ ایک شعر میں انھوں نے 'رمی' کے لفظ کی پرندوں کے لیے استعمال کی نشان دہی کی ہے (نقد فراہی، از رضی الاسلام ندوی، پہلا مضمون)، لیکن اس شعر میں فاعل کے تعین میں سہو ہوا ہے۔

۱۲؎ یہاں اگر پتھروں کا ہدف کنواں ہوتا، اور پتھر سنگ گل نہ ہوتے تو بلاشبہ وہ معنی پیدا ہو جاتے جب کسی کنویں کو پاٹنے کے لیے پتھر اس میں پھینکے جاتے ہیں۔کنویں میں یوں پتھر پھینکنے کے لیے بھی 'رمی' آ جاتا ہے۔لیکن یہ بھی پرندوں کے پنجوں میں سے گرانے کے مفہوم سے بہت بعید ہے۔بلکہ یہ اس انسانی عمل کے سراسر مشابہ ہو جاتا ہے، جب وہ دشمن کو بھگانے کے لیے پہاڑ سے بڑے بڑے پتھر لڑھکا دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے روایات کے لحاظ سے مناسب الفاظ چھوڑ کر یہی لفظ کیوں چنا؟

مدرسۂ فراہی کے اساطین، قرآن کے لفظوں کی اس شان کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، کہ یہ الفاظ علیم وحکیم خدا کے چنے ہوئے ہیں، انھیں روایات کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے۔ سورۂ فیل میں مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ چنا ہی اس لیے تھا کہ روایات کی اصلاح ہو۔ لیکن ہم نے قرآن کو حاکم ماننے کے بجاے روایات کے الفاظ کو حاکم مان لیا۔ وہ الفاظ جو راویوں کے حفظ وعدالت کے مرہون ہوتے ہیں۔

ازدیاد معنی در جملہ

لفظ کا یہ کردار بھی بہت اہم ہے، ہر لفظ جملے میں آ کر ایک نیا مطلب، بلکہ بعض اوقات پورے مضمون ہی کا اضافہ کر دے سکتا ہے۔ مثلاً زیر بحث گولی والے جملے کو دوبارہ دیکھیں:

''اس نے گولی کھائی''۔

اب اس میں 'پانی سے' کے الفاظ کا اضافہ کر دیں:

''اس نے پانی سے گولی کھائی''۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ان دولفظوں نے جملے کے مضمون میں معنی کا اضافہ کر دیا ہے، یعنی گولی پانی سے نگلنے کا عمل جملے میں مزید معلومات کو لے آیا ہے۔ یوں ایک ایک لفظ جملے میں مضمون اور مراد کے پہلو سے اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔

بعض جدید ماہرین لسانیات اس بات کو بنیاد بنا کر یہ کہتے ہیں: جملے میں جتنے الفاظ آتے جائیں گے، اتنے ہی معنی متردد اور مشتبہ ہوتے چلے جائیں گے، اس لیے کہ تعیین معنی کے لیے اتنے ہی امکانات بڑھتے جائیں گے۔ ہمارا نقطۂ نظر اس کے برعکس ہے۔ ہمارے نزدیک جتنے الفاظ جملے میں بڑھتے جائیں گے اتنے قرائن صارفہ بڑھتے جائیں گے۔ یوں الفاظ پر اتنے ہی پہرے لگتے جائیں گے۔ جس سے وہ تاویل واحد کی طرف ـــــ زیادہ صراحت سے ـــــ مائل ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً پہلے ہم نے لفظ 'گولی' بولا۔ اس کے متعدد معنی تھے، جن کا ذکر شروع میں ہوا۔ پھر ہم نے اسے چار لفظی جملے میں رکھا: ''اس نے گولی کھائی'' اس جملے کے باقی تین الفاظ نے 'گولی' کے متعدد معنی چھین کر اسے ایک پر محدود کر دیا تھا۔ لیکن ایک مرجوح، یعنی کمزور احتمال باقی تھا کہ 'کھانے' کا لفظ بندوق کی گولی کھانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ لہٰذا 'اس نے گولی کھائی' کا جملہ بظاہر تاویل واحد تک پہنچانے میں کمزور لگا۔ اگرچہ لسانی ذوق کے مطابق مفہوم واضح تھا۔ لیکن 'پانی سے' کے اضافہ نے اس مرجوح احتمال کو بھی رفع کر دیا۔ گویا اب یہ گولی صرف دوا کی گولی ہے۔

یوں الفاظ اپنے ہمسایہ لفظوں کے پہرے میں آ جاتے ہیں جس سے کلام میں دیگر معنی داخل ہونے میں رکاوٹ آ جاتی ہے۔

الفاظ حاملِ معنی

یوں الفاظ صرف اسی معنی کے حامل بن جاتے ہیں جس کو یہ الفاظ جملے میں اپنے ہمسایہ الفاظ کی پہرے داریوں میں باقی رکھ پاتے ہیں۔ ایک متکلم جب تکلم کے لیے الفاظ چن کر بولتا اور انھیں جملے کے نحوی بندھن میں پرو دیتا ہے تو یوں متکلم ان پر شدید پہرے بٹھاتا چلا جاتا ہے۔ الفاظ اور نحو کے پہرے دار صرف اسی معنی کو جملے میں آنے دیتے ہیں جو متکلم کے منشا کے مطابق ہوتے ہیں، باقی معنی کو یہ پہرے دار باہر ہی روک دیتے ہیں۔ ان پہرے داروں کی موجودگی میں بولنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اب میرا مدعا سامع تک پہنچ جائے گا، کیونکہ اس نے اپنے خیال میں لسانی تعامل کے سہارے پر الفاظ اور نحو کے کڑے حصار میں مدعا کو بند کر دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ عمل ہم اس سرعت اور ہوشیاری سے کرتے ہیں، جیسے ایک ماہر ڈرائیور ہر طرح کے شور ہنگامے اور رش میں پوری سرعت، ہوشیاری اور بے خیالی میں گاڑی چلائے جا رہا ہوتا ہے۔ گویا بولنا ہماری فطرت ثانیہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آمد[13] اور آورد[14] میں معیار کلام کا فرق ہوتا ہے، اس لیے کہ آمد میں ہمارا ذہن ماہر ڈرائیور کی طرح بے خیالی میں درست طور عمل کرتا جاتا ہے۔ شاید ہمارا لاشعور جب آزادی سے کام کرتا ہے تو زیادہ تخلیقی ہوتا ہے۔ سامع بھی ان پہرے داریوں کی مدد سے اسی سرعت سے ذہن میں جمع تفریق کرتے اور اصل مدعا تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سب ریاضی ایک سیکنڈ میں ہو جاتی ہے۔

مقدرات کا تحمل

لفظ جو بھی کلام میں آئیں، وہ اپنے ساتھ مقدرات لے کر آتے ہیں۔ جب لفظ جملے میں آ جاتے ہیں، اور متعدد معانی سے مجرد ہو کر ایک معنی تک محدود ہو جاتے ہیں، تو مقدرات اسی محدود حوالے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً گولی

۱۳؎ وہ شعر یا کلام جس میں تکلف نہ ہو، ہمارے قلب و ذہن کے آزادانہ عملِ تخلیق نے وجود پذیر کیا ہو۔ یہ کلام بہ تکلف تراشیدہ کلام سے بلند درجہ کا ہوتا ہے۔

۱۴؎ محنت و کوشش سے بات بنانا۔ بڑا تکلف کر کے شعر کہنا۔

والے دو جملے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ایک جملہ یہ بنا ہے کہ اس نے سینے پر گولی کھائی۔ اس میں گولی اب بندوق کی گولی کے معنی میں ہے تو اس لیے یہاں لفظ 'گولی' صرف بندوق کی گولی کے مقدرات کا حامل ہوگا۔ کنچے اور دوا کی گولی کے مقدرات کا نہیں۔ بندوق کی گولی لگنے کا مقدر موت یا شدید زخمی ہونا ہے۔ سینے پر گولی کھانے کا مقدر بہادری ہے۔ اب اس جملے پر کوئی بھی ایسا جملہ عطف ہوسکتا ہے، جو ان دو مقدرات سے متعلق ہو۔ مثلاً:

۱۔ اس نے سینے پر گولی کھائی، اور ہمارا سر فخر سے بلند کر گیا۔ (یہ سینے پر گولی کھانے کے مقدر ''بہادری'' پر عطف ہوا ہے۔ اگرچہ ''بہادری'' کا لفظ کلام میں موجود نہیں ہے)۔

۲۔ اس نے سینے پر گولی کھائی، اور داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے سرخ رو ہوا۔ (یہ گولی کے اثر کے مقدر ''موت'' کے لحاظ سے عطف ہوا ہے)۔

لیکن واضح رہے کہ جو مقدر کلام میں متکلم نے ملحوظ رکھا ہے، وہی پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اس کے ملحوظ مقدرات کو پیش نظر رکھے بغیر معنی کا تعین کر لیں۔ مثلاً اوپر کے پہلے جملے میں مقتول ہونے کا امکان موجود ہے، مگر ہم اس سے اس کی موت کا بس ہلکا سا اشارہ ہی پا سکتے ہیں، حتمی طور پر موت کو برآمد نہیں کر سکتے، اس لیے کہ سینے پر گولی کھا کر بچ جانا بہادری کے خلاف نہیں ہے۔ اس سے بھی یہی بات واضح کرنا پیش نظر ہے کہ مقدرات تک میں ہماری مدد صرف متکلم کے چنے ہوئے الفاظ اور تشکیل دیے ہوئے جملے ہی کرتے ہیں۔ یہ مقدرات بھی پہرے دار بن جاتے ہیں، اور متکلم کے منشا کی رسی سے سامع کو باندھے رکھتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماحول کی تشکیل

الفاظ جس طرح ہماری زندگی اور معاشرے سے جڑے ہوتے ہیں، اسی طرح ہمارے جذبات یا معاشرے کے تہذیبی احساسات سے بھی جڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ کلام میں ایک تہذیبی یا جذباتی ماحول تشکیل کرتے ہیں۔ یہ تہذیبی یا جذباتی احساسات کلام میں جب آتے ہیں، اور جو ماحول تشکیل کرتے ہیں، وہ ماحول ایک اور پہرے دار بن جاتا ہے، جو جملوں میں لازماً در آتا ہے۔ اس ماحول کی روشنی میں کلام ملی، قومی، وطنی، تہذیبی، دینی اور نہ جانے کتنے قسم کے احساسات سے ہمارے دل میں تحریک، تجمد، کشش یا کھچاؤ پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اوپر سینے پر گولی کھانے کے بیان نے گولی کھانے والے کے لیے ہماری محبت ہم سے حاصل کی ہے۔ اسی جملے سے دشمن ایک حسد یا تکلیف محسوس کرے گا۔

یوں لفظ ہماری نفسیاتی احساسات کا نمایندہ بھی بن جاتا ہے۔ الفاظ غصہ، نفرت، تنگ نظری، کشادگی، جرأت، بزدلی، غرض کئی جذبات واحساسات کو لیے کلام میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کسی کتاب پر کسی نے تقریظ[15] لکھی بظاہر اس میں کوئی منفی لفظ استعمال نہیں ہوا تھا، بلکہ مجموعی مضمون مثبت ہی تھا۔ مگر اس تقریظ کو پڑھنے کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ لگتا ہے کہ مصنف اور تقریظ نگار کے مابین اَن بن ہے، کیونکہ کتاب کی خوبی جس طرح کی تقریظ کا تقاضا کرتی ہے، تقریظ ویسی نہیں ہے۔ ذیل کے شعر میں ہم ایک میٹھی نغمگی، ایک لپک فریفتگی اور ایک نوع کا التماس محسوس کر سکتے ہیں۔ تمام احساسات بن بولے اس شعر میں سرایت کیے ہوئے ہیں:

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر میری ساری   اے بت کی پجن ہاری، اس بت کو پجاتی جا[16]

یوں الفاظ وجمل ماحول سا تشکیل کرتے ہیں، یہ ماحول تاثیر اور جمال پیدا کرتا ہے۔ گویا الفاظ ہماری تہذیبی، دینی، سماجی، علاقائی اور قومی شعور سے اٹھے ہوئے ماحول کو کلام میں لے آتے ہیں۔ یہ ماحول بھی لفظوں سے جڑے مصداقات کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ خواہ وہ مصداقات مادی ہوں یا معنوی۔ یہ بات شاید غلط نہ ہو کہ ہر مادی شے کے ساتھ ایک نہ ایک ذہنی تصور ضرور جڑا ہوتا ہے، جو زبان اور علم کی تشکیل میں کام آتا ہے۔ مثلاً میرے گھر میں ایک فقیر عورت آتی ہے، میری بیوی صرف اس لیے اس کو خیرات دیے بغیر نہیں رہ سکتی کہ جب وہ ''کون ہے؟'' پوچھنے پر کہتی ہے: ''مانگنے والی''، تو یوں وہ عجز، بے مائیگی اور مطالبہ سے بھرے ان دو لفظوں کو اپنے اوپر چسپاں کر کے جس پستی اور بے کسی کا اقرار کرتی ہے، وہ دل کو اندر تک پگھلا دیتا ہے۔ یہاں 'مانگنے والی' کے ساتھ جڑے ذہنی تصورات نے جادو کا اثر دکھایا ہے۔

موقع محل کی تشکیل

موقع محل سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ صورت حال جس میں کلام صادر ہو رہا ہوتا ہے۔ روز مرہ کے مکالموں میں ہم عموماً صورت حال جس میں ہم موجود ہوتے ہیں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیسے مذکورہ بالا فقیر خاتون کا گھر والوں کے ساتھ مکالمہ ایک موقع محل میں ہو رہا ہوتا ہے۔ وہاں موقع پر دیکھیے صرف دو جملے ہیں: ایک یہ کہ ''کون ہے؟'' اور

۱۵؎ Review، کتاب کے شروع یا اختتام پر مصنف کے علاوہ کسی اور کا عموماً تائیدی تبصرہ۔

۱۶؎ تجھ مکھ: تیرا چہرا۔ پجن ہاری: ''ہاری'' یا ''ہارا'' قدیم اردو میں اسم صفت بنانے کے لیے استعمال ہوتا تھا جس طرح ہم ''والا'' اور ''والی'' استعمال کرتے ہیں، مثلاً: پوجنے والا، پجنے والا وغیرہ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دوسرا یہ کہ ’’مانگنے والی‘‘۔لیکن اسی بات کو سمجھانے کے لیے مجھے باقی تفصیل بھی کرنی پڑی۔یعنی مجھے موقع محل کو لفظوں میں بیان کرنا پڑا۔ یہ موقع محل تو سب پہچان جاتے ہیں۔لیکن ایک موقع محل ہوتا ہے، جو یوں بیان نہیں ہوتا، بلکہ لفظوں میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔مثلاً ایک ادیب کے بارے میں ایک شاعر نے کہا:

علم و ادب کی بزم ہوئی سوگوار آج　　　محفل سے اٹھ گیا، وہ بلاغت نگار آج

یہاں دیکھیے ’’سوگوار‘‘ اور ’’اٹھ گیا‘‘ نے یہ موقع محل ہمیں بتایا کہ شاعر کسی بلاغت نگار ادیب کے مرنے پر یہ شعر کہہ رہا ہے۔ یوں ہم کلام کے اندر سموئے ہوئے موقع محل کو پا لیتے ہیں۔قرآن مجید اسی انداز سے موقع محل کو اپنے جملوں اور لفظوں سے بیان کرتا ہے اور یوں ساتھ ساتھ یہ بتاتا جاتا ہے کہ کس موقع کی بات ہے؟ کیا بحث چل رہی تھی؟ کس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے؟ سب ساتھ ساتھ واضح ہوتا جاتا ہے۔لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ لفظوں کو ان کا پورا پورا مقام دیا جائے۔مثلاً سورۂ احزاب کا درج ذیل مقام موقع محل کو سمجھنے کے لیے کسی زیادہ غور و فکر کا محتاج نہیں ہے:

> اِنَّ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا مُّهِيۡنًا. وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ بِغَيۡرِ مَا اكۡتَسَبُوۡا فَقَدِ احۡتَمَلُوۡا بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا. يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ يُدۡنِيۡنَ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِيۡبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَنۡ يُّعۡرَفۡنَ فَلَا يُؤۡذَيۡنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا. لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡمُرۡجِفُوۡنَ فِى الۡمَدِيۡنَةِ لَنُغۡرِيَنَّكَ بِهِمۡ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوۡنَكَ فِيۡهَاۤ اِلَّا قَلِيۡلًا. مَّلۡعُوۡنِيۡنَ اَيۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا وَقُتِّلُوۡا تَقۡتِيۡلًا. سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا. (الاحزاب ۳۳: ۵۷-۶۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہاں ’يُدۡنِيۡنَ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِيۡبِهِنَّ‘ کے الفاظ میں بعض متعین خواتین کو ادنائے جلباب کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم کس موقع محل میں دیا گیا ہے، اسے یوں نہیں بتایا گیا، جیسا میں نے اوپر فقیر عورت کے بارے بتایا تھا، بلکہ کلام کے مضمون میں لپیٹ کر بتایا گیا ہے۔آیت کے خط کشیدہ الفاظ سے واضح ہے کہ حکم کے آگے اور پیچھے، یعنی سیاق و سباق میں کچھ ایسی تفصیلات دی ہیں جن سے موقع محل واضح ہو رہا ہے۔

حکم سے پہلے یہ اللہ اور رسول کو اذیت دینے، اور مسلمانوں پر تہمت لگانے والوں کو بتایا گیا ہے کہ انھیں سزا ملے گی، اس لیے کہ وہ ’اثم مبین‘ کے مجرم ہیں۔اللہ اور رسول کو اذیت دینے والوں کو دنیا و آخرت کی سزا کی وعید سنائی ہے۔

یہ حکم کا سباق ہوا، پھر سیاق میں مزید باتیں واضح ہوتی ہیں کہ صحابیات کے اس حکم پر عمل کے باوجود اگر یہ اور یہ لوگ بعض نہ آئے تو سخت اقدام کیا جائے گا۔ اس سباق اور بالخصوص سیاق سے معلوم ہوا کہ منافقین، حسد کے مریضوں، سنسنی پھیلانے والے وحشت گردوں[۱۷] کی تہمت بازیوں سے بچنے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔ یوں دیکھیے کہ بعض کرداروں کے ساتھ معاملہ کے لیے چند احکام و اقدامات کا ذکر ہوا ہے، اور ایسا کرنے سے موقع محل بھی واضح ہو گیا ہے۔ جن افراد اور گروہوں کا ذکر کر کے انھیں کہا گیا ہے کہ اب رک جاؤ، ورنہ یہ سخت اقدامات کیے جائیں گے۔ یہ سب الفاظ اس موقع محل سے آگاہ کر رہے ہیں، جس میں کلام نازل ہوا تھا۔ لہٰذا کلام میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں، جن میں صدورِ کلام کے وقت کے حالات کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ انھی الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ بات کن سے ہو رہی ہے، حکم کی نوعیت کیا ہے وغیرہ۔

مرکبِ پیغام

اوپر کی ساری گفتگو میں یہ بات واضح ہے کہ الفاظ مفردات اور کلام کی صورت میں پیغام رسانی کا واحد ذریعہ ہیں۔ میں آپ کے مدعا کو اور آپ میرے مدعا کو میرے ذہن میں اتر کر نہیں، بلکہ الفاظ کے فہم ہی سے جان سکتے ہیں۔ میں نے جو پیغام دینا تھا، اس کے لیے میں نے جو الفاظ چنے میں وہی کہنا چاہتا ہوں، اور جو الفاظ آپ نے چنے آپ وہی کہنا چاہتے تھے۔ آپ کے اور میرے پیغام کے حامل بس وہی الفاظ ہیں جو میں نے اور آپ نے چنے۔ ان الفاظ سے جو معنی سامع تک منتقل ہو گا، بس وہی میرا اور آپ کا مدعا ہے۔ خارج سے کوئی چیز ان الفاظ میں ٹھونسنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے متکلم کی نہیں کسی اور کی بات سنی ہے۔

لہٰذا ماضی میں جب ہم نے فقہی اختلافات کے حل کی کش مکش کے دوران میں اپنے حق میں روایاتِ آحاد کو اور قیاس کے نام پر عقل کو استعمال کیا، تو بعض نے خاموشی سے اور بعض نے علانیہ کلام الٰہی پر تہمت دھر دی کہ اس کے الفاظ کی دلالت تو ظنی ہوتی ہے، اس لیے فیصلہ کے لیے خارج کو بیچ میں لانا پڑے گا، اور افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ آحاد سے جو چیز خارج سے لائی گئی، وہ پھر الفاظ ہی میں ہوتی تھی، لیکن وہ قطعی شمار ہوتی تھی، اس لیے کہ وہ ہماری پسند

---

[۱۷] اس کے لیے قرآن میں 'مرجفون' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی منفی اور فتنے پھیلانے والی باتوں کی ٹوہ میں رہنا، یہ باتیں حاصل کر کے انھیں معاشرے میں پھیلا کر اضطراب و وحشت پیدا کرنا تاکہ معاشرے کا امن و چین برباد ہو، یا کسی گروہ یا حکومت کے خلاف بے اعتمادی پیدا ہو۔ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے یہ جرم ہر حزب اختلاف کا سیاسی عمل بن گیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کی ہوتی تھی۔ یہ تضادِ فکر ایک طرف فطرت پر کھڑا تھا اور دوسری طرف مسلک پرستی پر۔ جب آحاد کی لفظی دلالت کو فیصلہ کن مانا گیا تو دلالت الفاظ کی قطعیت کی فطرت لاشعور میں کارفرما تھی، اور قرآن کے الفاظ کی دلالت کو ظنی مانا گیا تو اپنے مسلک کی عصبیت کا فسوں نگاہوں پر پٹی باندھ رہا تھا۔ لہٰذا یہ تضادِ فکر کہ آحاد کے الفاظ کی دلالت قطعیت ہے اور الفاظِ قرآن کی دلالت ظنی ہے، دبا رہا۔ حالاں کہ قرآن اور اخبارِ آحاد میں بولے گئے ملفوظات کا الفاظ ہونے میں کوئی جوہری فرق نہیں تھا، بلکہ چناؤ میں قرآن کے الفاظ بے خطا تھے۔ لیکن پھر بھی مسلک نے آحاد کا پلڑا بھاری کر دیا اور قرآن کا ہلکا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کو قرآن کا اصل مقام لوٹایا جائے اور اس کے الفاظ کی حاکمیت مانی جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com